انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی ۲۵

مسلک کا فرق اور ملّی اتّحاد

مولانا محمد عبداللہ طارق دہلوی

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز
۱۶۲ جوگا بائی، مین روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ

تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں (حجرات: ۱۰)

مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ، إِذَا اشْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى۔

باہمی محبت و ہمدردی اور مہربانی کرنے میں ایمان والوں کی مثال ایک جسم کی سی ہے، جب اس کے کسی ایک عضو میں کوئی تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں اس کا شریکِ حال رہتا ہے۔ (بخاری و مسلم)
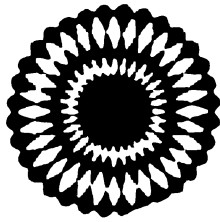
ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

(اقبالؒ)

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

(اقبالؒ)

پیش لفظ

ملت کی فرقہ بندیوں اور ان کے آپس کے نزاع وافتراق کو دیکھ کر ہر صاحبِ دِل مومن ضرور کڑھتا ہے لیکن ہر شخص اس کے وجوہ واسباب کو نہیں جانتا، اور جب سطحی طور پر ــــــ مسلمانوں کے فقہی مسالک اور مختلف مکاتبِ فکر کے فرق پر غور کیا جاتا ہے تو بسا اوقات آدمی خود شریعت ہی کے مجموعی نظام سے بدگمان ہونے لگتا ہے۔ اور ملت کے افتراق کی اصل وجہ ان فقہی اختلافات ہی کو قرار دینے لگتا ہے، وہ ان فرقہ بندیوں کا حل یہ تجویز کرتا ہے کہ یہ سب لوگ اپنے اپنے مسالکِ فقہ اور مکاتبِ فکر کو چھوڑ کر ایک ہو جائیں حالانکہ یہ ایک بہت سطحی طرزِ فکر اور ناقابلِ عمل تجویز ہے۔

شریعت کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ فقہی اختلافات ختم ہو جائیں اور نہ ماضی میں کبھی ایسا ہوا ہے نہ آئندہ ہو سکے گا بلکہ ہر دور میں جیسے جیسے نئے مسائل پیدا ہوں گے اور لوگ شریعت کی روشنی میں ان کا حل تلاش کریں گے تو رایوں کا فرق بھی ضرور ہوتا رہے گا، خالقِ کائنات نے جس طرح دنیا کے کوئی سے دو انسانوں کے چہرے یکساں نہیں بنائے اسی طرح ان کی فکر ورائے بھی یکساں نہیں ہو سکتیں۔

ہندوستان وپاکستان کے مانے ہوئے عالم وفقیہہ اور مفتیِ اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک جگہ فرمایا ہے:

"اختلافِ رائے ایک فطری اور طبعی امر ہے جس سے نہ کبھی انسانوں

کا کوئی گروہ خالی رہا نہ رہ سکتا ہے، کسی جماعت میں ہر کام اور ہر بات میں مکمل اتفاقِ رائے صرف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے:

ایک یہ کہ ان میں کوئی سوجھ بوجھ والا انسان نہ ہو جو معاملہ پر غور کر کے کوئی رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس لئے ایسے مجمع میں ایک شخص کوئی بات کہہ دے تو دوسرے سب اس پر اس لئے اتفاق کر سکتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی رائے اور بصیرت نہیں ہے۔

دوسرے اس صورت میں مکمل اتفاقِ رائے ہو سکتا ہے کہ مجمع کے لوگ ضمیر فروش اور خائن ہوں کہ ایک بات کو غلط اور مضر جانتے ہوئے محض دوسروں کی رعایت سے اختلاف کا اظہار نہ کریں۔

اور جہاں عقل بھی ہو اور دیانت بھی، یہ ممکن نہیں کہ ان میں اختلافِ رائے نہ ہو۔ (وحدتِ اُمت ص ۱۲-۱۴ ، از مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

اس لئے جب اختلافِ رائے ناگزیر ہے اور قومی و اجتماعی زندگی میں اس کے بغیر چارہ نہیں تو اس سے عہدہ برآ ہونے کی بہترین اور قابلِ عمل صورت جس کی مثالیں ہمیں خیر القرون ـ عہد رسالت اور عہد صحابہ و تابعین ـ میں بھی ملتی ہیں یہی ہے کہ فقہی یا دیگر نظری و فکری اختلافِ رائے کو بس اسی حد تک محدود رکھا جائے ایک طبقہ نہ اپنی رائے کو دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کرے نہ اسے عزت و وقار کا مسئلہ بنائے اور ہر فردِ ملت کے ساتھ ان چند اختلافی چیزوں کے علاوہ باقی بے شمار معاملات میں جو اتحاد و یک جہتی موجود ہے اس رشتے سے ان سے میل جول اور معاشرتی تعلقات کو بحال کرنے کی کوشش کرے۔

زیر نظر پمفلٹ میں کتاب و سنت سے اس کی ہدایات اور اسلام کے ابتدائی دور سے اسی حقیقت کی چند مثالیں پیش کی گئی ہیں کہ کس طرح وہ لوگ مسائل میں بہت سے اختلافات کے باوجود آپس میں شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔

اللہ کرے یہ کوشش مقبول اور بار آور ہو۔

۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ

۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء

محمد عبداللہ طارق

۱۴۸۔ حضرت نظام الدینؒ

نئی دہلی ۱۳ ۰۰ ۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

مختلف طبقاتِ ملت کے باہمی حالات کے جائزے اور طویل غور و فکر اور صحابہ کرام و تابعین عظام کے معاشرے کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مسالک اور مکاتبِ فکر کے ہزار اختلافات کے باوجود اگر مسلمانوں کے مختلف طبقات کے درمیان اسلامی اُخوّت کے رشتے اُستوار اور ان کے معاشرتی تعلقات ہموار ہوں تو اس میل جول اور اس قُرب و یگانگت سے سیکڑوں خلیجیں پٹتی رہتی اور وقتاً فوقتاً کھڑی ہونے والی سینکڑوں تفریق کی دیواریں خود بخود منہدم ہوتی رہتی ہیں۔

آپ کتبِ شریعت میں مسائلِ فقہ کے متعلق صحابہ و تابعین کی رایوں کا مطالعہ کریں تو ان کے درمیان بے شمار اختلافات نظر آئیں گے لیکن کیا مجال کہ اُن فقہی اختلافات کی بنیاد پر ان کے درمیان کسی قسم کی کوئی دوری یا کوئی نفرت پیدا ہوئی ہو یا ایک دوسرے کے خلاف کوئی نفرت انگیز لفظ بولا ہو؛ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ اس فقہی اختلاف کو معاشرتی افتراق کا اور نتائجِ فکر و تدبر کے اس فرق کو اپنی باہمی پھوٹ کا سبب نہیں بننے دیتے تھے، اور ان اختلافات کو اپنے معاشرتی

تعلقات سے بالکل الگ رکھتے ہوئے جس شخص کا جو حق ہے اس کو رشتۂ اُخوتِ اسلامی کے مطابق پوری طرح نباہتے تھے۔ اُس دَور میں کسی معاملے پر تلواریں نکل آنے اور باہم برسرِپیکار ہو جانے کی مثال تو آپ تلاش کر سکتے ہیں مگر معاشرے کے کٹ کر ٹکڑے ہو جانے اور ایک طبقے کے دوسرے سے قطع تعلق کر لینے کی مثالیں ملنا بہت مشکل ہے۔

کسی شخص کی ایک معاملے میں غلط رائے سے متفق ہونا اور اس میں اپنے ضمیر و دیانت کے خلاف اس کی ہمنوائی کرنا تو جائز نہیں اور یہ ایک بالکل الگ معاملہ ہے لیکن اس ایک معاملے کے علاوہ اسلام کی بے شمار چیزوں میں جو اس کے اور ہمارے درمیان اشتراک ہے ان کی بنیاد پر اس سے اسلامی اُخوت اور برادرانہ تعلقات قائم رکھنا مستحسن اور پسندیدہ صفت ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے سلسلے میں اپنے چار اصحاب کا خصوصیت سے نام لیا تھا کہ جو قرآن مجید سیکھنا چاہے وہ ان حضرات سے سیکھے اور ان کا طریقہ اپنائے ان میں سرفہرست حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں[1]۔ اور ان کی رائے قرآن مجید کی مکمل دو سورتوں سورۂ فلق اور سورۂ ناس کے متعلق جمہور صحابہ و تابعین اور تمام ملت کے برخلاف یہ ہے کہ یہ قرآن مجید کا حصہ نہیں، کہیں قرآن مجید میں لکھی ہوئی دیکھتے تو کھرچ ڈالتے تھے[2]۔ مسند احمد میں ہے کہ ان کو اپنے خیال پر اصرار تھا: واصرّ علی ظنہ[3]۔

آپ جانتے ہیں کہ قرآن مجید کے ایک لفظ کا انکار بھی شریعت کی نظر میں کتنا سنگین جرم ہے لیکن مستقل دو سورتوں کے انکار کے باوجود اس پاکیزہ

---

[1] الاستیعاب ۲: ۳۱۹، الاصابۃ ۲: ۳۶۹۔ [2] مسند الامام احمد ۵: ۱۲۹، ۱۳۰، مجمع الزوائد ۷: ۱۴۹، الدر المنثور ۶: ۴۱۶۔

[3] مسند احمد ۵: ۱۳۰۔

ترین دور میں جس سے زیادہ حمایتِ حق اور مزاحمتِ باطل کا کسی دور میں تصور نہیں کیا جا سکتا اُن کے خلاف نہ کوئی ہنگامہ اٹھا اور نہ اُن کی عُلوِ شان اور بلندیِ مقام پر اس کا کوئی اثر پڑا اور نہ ان کے خلاف اس بات کی وجہ سے کبھی کسی نے کوئی لب کشائی کی، حالانکہ ان کی اس منفرد رائے سے کبھی کسی نے اتفاق بھی نہیں کیا، ان کی رائے معاذ اللہ یہ نہ تھی کہ وہ ان سورتوں میں مندرج حکمِ خدا کو نہیں مانتے بلکہ وہ یہ کہتے تھے کہ یہ مُعوِّذتین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے گئے سحر کو دور کرنے کے لئے بطور دُعا، نازل ہوئی تھیں ان کو قرآن مجید کا حصہ قرار دینا غلط ہے، لیکن ان کی یہ دلیل کسی نے تسلیم نہیں کی، مشہور محدث حافظ ابوبکر البزّار (متوفی ۲۹۲ھ) فرماتے ہیں: لم يتابع ابنَ مسعودٍ أحدٌ من الصحابة وقد صح عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قرأ بهما في الصلاة و اُثبتتا في المصحف یعنی کسی بھی صحابی نے اس معاملے میں حضرت ابن مسعودؓ سے موافقت نہیں کی اور یہ بات صحیح سندوں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوچکی ہے کہ آپؐ نے یہ دونوں سورتیں نماز میں بھی پڑھی ہیں اور (آپ کی ہدایات کے مطابق) ان دونوں کو مصحف (قرآن مجید کے تحریری مجموعے) میں بھی شامل کیا گیا۔[1]

حضرت اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ بھی انہی چار صحابۂ کرام میں ہیں جن کی قراتِ قرآن کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت سے سندِ اعتماد عطا فرمائی ہے ان سے زِرّ بن حُبَیشؒ نے پوچھا کہ آپ کے بھائی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ مُعوِّذتین کے قرآن ہونے کے منکر ہیں ان کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ حضرت اُبَیّ بن کعبؓ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی رائے پر تو اظہار خیال نہیں کیا ہاں معوذتین کے متعلق جو کچھ انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا وہ نقل کر دیا۔[2]

---

[1] مجمع الزوائد ج ۷، ص ۱۴۹۔

[2] صحیح بخاری ۲: ۷۴۴، مسند الامام احمد ۵: ۱۲۹۔ ۱۳۰۔

کسی مؤمن بھائی کا حق پہچاننے اور علم دین کا حق ضائع نہ ہونے دینے کی یہ بہترین مثال ہے جس کا مظاہرہ حضرت اُبی بن کعبؓ نے فرمایا۔[1]

خلافت عثمانی کے زمانے میں ایک بار حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے پرجوش خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں زید بن ثابتؓ کی قراءت کے مطابق قرآن پڑھوں، خدا کی قسم! میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت ستر سورتیں سیکھ چکا تھا جبکہ زیدؓ ابھی بچہ تھے اور بچے ان کا کھیل بناتے پھرتے تھے، اسی خطبے کا ایک لفظ یہ بھی تھا کہ وما احد اعلم بکتاب اللہ منی (کتاب الٰہی کو مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے) ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ "میں تم سے بہتر نہیں ہوں"۔

شقیق راوی جو اس خطبے کے دوران وہیں موجود تھے بیان کرتے ہیں کہ میں اس خطبے کے بعد پھر اسی حلقے میں بیٹھا رہا اور اس میں متعدد صحابہ کرامؓ بھی موجود تھے مگر ان میں سے کسی نے بھی حضرت ابن مسعودؓ کی بات کو نہ ناپسند کیا نہ تردید کی۔[2]

طبقاتِ ابن سعد (۲: ۱۷۱) میں ہے کہ زید بن وہبؒ (تابعی) نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن مجید کی ایک آیت پڑھی تو وہ انھوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے طریقے سے ذرا مختلف طریقے پر پڑھائی اس پر زید بن وہبؒ نے عرض کیا کہ حضرت عمرؓ نے تو مجھے یہ آیت اِس اِس طرح پڑھائی تھی؟ حضرت عمرؓ کا نام سننا تھا کہ حضرت ابن مسعودؓ رو دیے اور زید کہتے ہیں کہ اتنا روئے کہ (حتّٰی رأیتُ دُموعَہ خلالَ الحصی) میں نے زمین پر کنکریوں کے درمیان ان کے آنسو ٹپکتے دیکھے، اور انھوں نے فرمایا: تم اُسی طرح پڑھو جس طرح حضرت عمرؓ نے تمھیں پڑھایا ہے اور پھر حضرت عمرؓ کی بہت سی خوبیوں اور کمالات کا تذکرہ کیا۔[3]

اس واقعہ کے علاوہ حافظ ابن قیمؒ نے "اعلام الموقعین" میں لکھا ہے کہ جن مسائل

---

[1] الاستیعاب ۲: ۳۲۳۔

[2] حیاۃ الصحابہ (عربی) ۳: ۱۵۰، بتحقیق راقم الحروف۔

میں حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے اُن کی تعداد تقریباً سو ہے[1]
لیکن اس بات کی وجہ سے ان دونوں کی باہمی محبت و تعلق اور ایک دوسرے
کی تعظیم و احترام میں کبھی کوئی ادنیٰ فرق نہیں آیا۔

حضرت عمار بن یاسرؓ مشہور صحابی ہیں اور حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے معرکے
میں حضرت علیؓ کی طرف تھے اور اہم رول ادا کر رہے تھے مگر عین معرکے کے دوران
بھی جب ایک شخص نے حضرت عائشہؓ کی شان میں کوئی نازیبا لفظ کہا تو اس کو بہت
ڈانٹا اور سخت سست کہا اور فرمایا: "اشهد انها زوجة رسول الله صلى الله
عليه وسلم في الجنة[2]" (میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؓ جنت میں بھی حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم اور آپ کی اہلیہ ہیں)

اور ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ انھوں نے فرمایا: نالائق! دفع ہو جا! تو
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ کو تکلیف پہنچاتا ہے[3]۔

اسی موقع کے بارے میں ابن عساکرؒ اور ابو یعلیٰؒ نے بیان کیا ہے کہ جب
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میدانِ کارزار کی طرف روانہ ہوئیں تو حضرت عمار بن
یاسر رضی اللہ عنہ جو ان کے مد مقابل تھے نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ" ہماری محترمہ
اماں جان اپنی مُہم پر روانہ ہو چکی ہیں اور ہم اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی:

ولكن الله ابتلانا بها	لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ ہماری
ليعلم إياه نطيع	آزمائش کی ہے وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے
أم إياها[4]	کہ ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں یا ان کے؟

---

[1] اعلام الموقعین عن رب العالمین ۲: ۲۱۸۔

[2] حیاۃ الصحابۃ (عربی) ۲: ۱۴۔ [3] ایضاً۔

[4] ایضاً۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ جماعتی زندگی میں ارکانِ جماعت کے لئے اور اہم شخصیات سے عقیدت و وابستگی رکھنے والے افراد کے لئے نہایت اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ کس حد تک کسی شخصیت کی پیروی کی جائے اور کس موڑ پر پہنچ جانے کے بعد "شخصیت" اور "حق" کے مابین موازنہ کیا جائے، اور اس بات کی جانچ پڑتال کی جائے کہ "شخصیت" کہیں "حق" سے منحرف تو نہیں ہو رہی ہے، اور ٹھیک اسی موڑ پر آ کھڑے ہونے کے وقت کے لئے ہادیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ رہنمائی ہے جس کی پابندی ہر کلمہ گو پر لازم ہے کہ:

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ[1] — خالق کی نافرمانی ہونے کی صورت میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

جو شخص اس نازک اور خطرناک آزمائشی موڑ پر پہنچنے کے بعد بھی کسی انسان کی پیروی جاری رکھتا ہے اس نے بلاشبہ اس شخص کو غیر شعوری طور پر "رب" اور "اِلٰہ" بنا لیا ہے، حضرت عَدِیّ بن حاتم رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں وہ ایک بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ سورۂ براءۃ کی یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے:

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ — (یہود و نصاریٰ نے) خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو "رب" بنا لیا ہے۔

(آیت ۳۱)

حضرت عدیؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے اس آیت کا مطلب سمجھاتے ہوئے فرمایا: کہ ایسا نہیں تھا کہ یہ لوگ اپنے علماء و مشائخ کی پوجا کرتے ہوں بلکہ ہوتا یہ تھا کہ یہ علماء و مشائخ جس چیز کو حلال قرار دیدیتے تو یہ لوگ اُسے حلال مانتے تھے اور جسے

---

[1] یہ روایت تھوڑے تھوڑے لفظی فرق سے متعدد کتب حدیث میں کئی صحابہ کرام سے صحیح اور حسن سندوں سے نقل کی گئی ہے (جامع صغیر ۶: ۴۳۲، مشکوٰۃ صفحہ ۱۰۸۵ حدیث نمبر ۳۶۶۴، و صفحہ ۱۰۸۶ حدیث نمبر ۳۶۶۵، صفحہ ۱۰۹۲ حدیث ۳۶۹۶، مجمع الزوائد ۵: ۲۲۵-۲۲۶)

ان کے علماء حرام قرار دیدیتے اسے حرام[1]۔ گویا ان کا کسی بات کو کہدینا بجائے خود اک شریعت قرار پاگیا تھا۔

ابوالشیخؒ اور بیہقیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت حذیفہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اما انہم لم یکونوا یعبدونہم ولکنہم أطاعوہم فی معصیۃ اللہ (ایسا نہیں تھا کہ یہ لوگ اپنے علماء و مشائخ کی پوجا کرتے ہوں بلکہ وہ اللہ کی نافرمانی کی صورت میں بھی ان کی فرماں برداری کیا کرتے تھے[2]) گویا اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے عبادت کرنے سے تعبیر فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے نصیحت فرمائی ہے کہ لوگو! إمَّعَۃ نہ بنو! پوچھا گیا کہ إمَّعَۃ کیا چیز ہے؟ فرمایا: إمَّعَۃ یہ ہے کہ آدمی کہے "انا مع الناس" یعنی تو لوگوں کے ساتھ ہوں، وہ ہدایت پر قائم رہیں گے تو میں بھی ہدایت پر قائم ہوں اور وہ گمراہ ہوں گے تو میں بھی گمراہ ہوں، آپؓ نے ہدایت کی خود کو اس بات کا پابند بناؤ کہ اگر سارے لوگ بھی کفر کرنے لگیں تو تم کفر نہیں کروگے۔ ألا لیوطنن أحدکم نفسہ علی ان کفر الناس ان لا یکفر[3]۔

خیر یہ بات یہاں ضمناً آگئی میں یہ عرض کر رہا تھا کہ خیرالقرون میں ہر اختلاف اسی ایک اختلافی مسئلے تک محدود رہتا تھا اس کی بنیاد پر معاشرہ تقسیم اور بھائی سے بھائی جدا نہیں ہوجاتا تھا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ نے ان سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا مطالبہ کیا انھوں نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں

---

[1] ترمذی، ابن سعد، بیہقی وغیرہم عن عدی بن حاتم رضؓ۔ (الدرالمنثور ۳: ۲۳۰)

[2] الدرالمنثور ۳: ۲۳۱۔ [3] حلیۃ الأولیاء ۱: ۱۳۷۔

ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑیں سب صدقہ ہوتا ہے[1]۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت صدیقؓ سے پوچھا کہ جب آپ کا اِنتقال ہوگا تو آپ کا کون وارث ہوگا؟ انھوں نے جواب دیا کہ ولدی واھلی: (میری اولاد اور اہلِ خانہ) پوچھا کہ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم رسول اللہ کے وارث نہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ اِن النبی لا یُورث (نبی کا کوئی وارث نہیں ہوتا) ہاں جن جن کا بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھاتے تھے ان کا میں بھی اٹھاؤں گا اور جن پر آپ خرچ کیا کرتے تھے میں بھی کرتا رہوں گا۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے بعد یہ معاملہ حضرت عمرؓ کے سامنے بھی پیش ہوا حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے اور یہ معاملہ رکھا اور بظاہر کسی حد تک شدّت سے رکھا، مسند احمد کے الفاظ یہ ہیں کہ قد ارتفعت أصواتھما (ان دونوں حضرات کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں) حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کچھ تھا اس کے بارے میں ہمیں کیا کرنا ہے ہم نے اس پر غور کرلیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکرؓ اس کے ذمہ دار بنائے گئے اور انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روش اختیار کی اور اب ابوبکرؓ کے بعد میں ذمہ دار بنایا گیا ہوں اور میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں بھی اس میں وہی کروں گا جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اور ابوبکرؓ نے کیا تھا۔

پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھ سے ابوبکرؓ نے بیان کیا تھا اور انھوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ بالکل سچ سچ کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا تھا کہ نبی کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں مسند احمد میں صحاح میں اور اکثر کتبِ حدیث میں بہت سی روایات ہیں ہمیں اِس وقت اِن واقعات کی تفصیل سے غرض نہیں کہنا یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کا حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے جاننے اور حضور اکرمؐ کی

---

[1] مسند احمد جلد اول حدیث نمبر ۹، ۱۴، ۲۵، ۵۵، ۵۸، ۶۰، ۸، ۷، ۹، وغیرہ۔

حدیث سننے کے بعد بھی حضرت عمرؓ کے پاس وہی پرانا مطالبہ لے کر آنے کا مطلب سوائے اس کے اور کیا تھا کہ یہ دونوں حضرات حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے سے متفق نہ تھے اور حدیث نبوی کی ان کے ذہن میں کوئی اور توجیہ تھی، یعنی یہ تو ناممکن ہے کہ ارشاد نبوی سنکر یہ حضرات اپنی رائے نہ بدلیں لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ کسی وجہ سے اس استدلال سے وہ مطمئن نہ ہوں۔ اور پھر حضرت عمرؓ نے بھی وہی فیصلہ سنایا جو حضرت ابوبکرؓ کا تھا۔

اس واقعے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب خلافت صدیقی کے بالکل آغاز کا ہی ایک دوسرا واقعہ ملاحظہ فرمائیے جو متعین طور پر انھی دو حضرات حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے تعلق رکھتا ہے، اور اس بات کو بھی ذہن میں رکھئے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے سلسلے میں حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ بعض اہم حضرات کو اس شورے میں مدعو کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا جن میں سے ایک حضرت علیؓ بھی تھے جس کا انھیں بجا طور پر گلہ[1] بھی تھا، جو بعد کو دور ہو گیا تھا، ایسے حالات میں حضرت ابوسفیانؓ ان دونوں حضرات کے پاس آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اے علیؓ! اور اے عباسؓ! یہ کیا معاملہ ہے کہ یہ چیز (خلافت) قریش کے ایک بہت پست اور بہت کم تعداد قبیلے میں چلی گئی (فی اذل قبیلة من قریش واقلها) خدا کی قسم اگر تم چاہو تو میں اس کے (ابوبکرؓ کے) مقابلے پر سواروں اور پیادوں سے مدینہ کو بھر دوں؟

آپ جانتے ہیں کہ جو شخص یہ بات کہہ رہا ہے وہ قریش کا سپہ سالار رہے ——— اسلام کے خلاف تمام معرکہ آرائیاں اسی کی منصوبہ بندی سے ہوئی تھیں اس کا دعوی محض زبانی نہیں ہے وہ اس میدان کا خوب کھیلا ہوا ماہر ہے اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ ایسی ہستیاں نہیں تھیں کہ ان کے نام پر لوگ جمع نہ ہو جاتے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ ساری امت کی طرف سے بے حد

---

[1] مستدرک حاکم ۳: ۶۶، اور سنن بیہقی ۸: ۱۵۲، میں ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ ہمیں ناگواری صرف یہی تھی کہ ہمیں شورے میں نہیں بلایا گیا ورنہ ہم حضرت ابوبکرؓ کو خلافت کا سب سے زیادہ اہل سمجھتے ہیں۔

جزائے خیر عطا فرمائے۔ انھوں نے جواب میں کیا فرمایا:

لا واللہ لا أرید أن تملأھا علیہ خیلا ورجالا ، ولولا إنا رأینا أبا بکر لذلك أھلا ما خلیناہ و إیاھا۔	نہیں! خدا کی قسم میں نہیں چاہتا کہ آپ مدینہ کو ابو بکرؓ کے خلاف سواروں اور پیادوں سے بھر دیں، اور اگر ہم نے ابو بکرؓ کو اس کام کے لئے اہل نہ سمجھا ہوتا تو خلافت کو ان کی طرف نہ چلی جانے دیتے۔

اور فرمایا: ابوسفیان! تمام اہل ایمان ایک قوم ہیں جن میں کا ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ، اور ہر ایک دوسرے سے محبت کرنے والا ہوتا ہے خواہ ان کے بلاد اور آبدان میں کیسے ہی فاصلے کیوں نہ ہوں، اور منافقین وہ لوگ ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں[1]۔

اور مُصَنَّف عبدالرزاق نے اس واقعے میں مزید یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا: ابوسفیان! تم ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کے دشمن ہی رہے (ما زلت عدوّا للإسلام و أھلہ) لیکن تمھاری دشمنی سے کبھی نہ اسلام کا کچھ بگڑا نہ اہلِ اسلام کا (فما ضرّ ذلك الإسلامَ و أھلَہ شیئاً)۔ اور پھر وہی بات فرمائی کہ ہم نے ابو بکرؓ کو اس کے لئے اہل سمجھا ہے[2]۔

اور اس کے علاوہ کتب حدیث میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بے شمار اقوال ملتے ہیں جن میں انھوں نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا بہت بلند الفاظ میں ذکر کیا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں ان دونوں حضرات کی غیر معمولی محبت و عظمت تھی اور ان کی نیکی و دیانت کو وہ سب سے

---

[1] کنز العمال ۵: ۳۸۵

[2] الإستیعاب ۴: ۸۷، المستدرک للحاکم ۳: ۷۸۔

بڑھ کر قرار دیتے تھے۔ امام طبرانیؒ نے معجم اوسط میں لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کی مجلس میں جب بھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ذکر ہوتا تو وہ فرماتے: السباق تذکرون، السباق تذکرون (کیا تم اس سبیری[1] کا ذکر کرتے ہو، تم اُس سبیری کا ذکر کرتے ہو) پھر قسم کھا کے فرماتے تھے کہ ہم لوگوں نے جب بھی امور خیر میں آگے بڑھنے کی کوشش کی ہمیشہ ابو بکرؓ ہی ہم سب سے آگے رہے[2]۔

قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر ایک شخص کا ذکر ہے جو خاندان فرعون کا تھا اور خفیہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا قرآن مجید میں اس کی بہت سی باتیں نقل کی گئی ہیں جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دفاع میں اور ان کی دعوت کی تائید میں کہی تھیں۔ حضرت علیؓ نے بہت تفصیل سے حضرت ابو بکرؓ سے اس کا موازنہ کر کے اخیر میں فرمایا کہ ابو بکرؓ کا ایک لمحہ اس شخص کی ساری عمر سے بہتر ہے وہ شخص اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا اور ابو بکرؓ نے اپنے ایمان کا سرِعام اعلان کیا تھا[3]۔

جنگ جمل میں جو اہل اسلام خلیفۂ وقت حضرت علیؓ کے مقابلہ میں تلوار لیکر میدان میں آئے تھے اور جنگ کی تھی ان کے متعلق جب حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ کیا یہ لوگ مشرک ہیں؟ فرمایا: شرک سے بھاگ کر ہی (تو اسلام کی طرف) آئے ہیں، پوچھا گیا: تو کیا یہ منافق ہیں؟ آپؓ نے اس سے بھی انکار کیا تو پوچھا گیا کہ تو پھر یہ لوگ کیا ہیں؟ فرمایا: "اِخوانُنا بَغَوا علینا" ہمارے بھائی ہیں انھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے[4]۔

---

[1] "سبیری" مقابلہ میں سب سے سبقت لے جانے والا۔

[2] مجمع الزوائد ۹: ۴۶۔

[3] ایضاً ۹: ۴۷۔

[4] حیاۃ الصحابہ (عربی) ۲: ۱۲ عن سنن البیہقی ۸: ۱۷۳۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رُعب و ہیبت اور ان کا دبدبہ تو مشہور ہے انھیں ایک عورت کے متعلق کچھ کردار کی کمزوری کی شکایت پہنچی انھوں نے تحقیق حال کے لئے اس کو بلایا، وہ سخت خوفزدہ ہوگئی کہ ہائے افسوس! حضرت عمرؓ کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا؟ (یا ویلہا، مالہا ولعمر؟) وہ حاملہ تھی، حضرت عمرؓ کی طرف چلی اور مارے خوف و دہشت کے راستے ہی میں اس کو دردِ زِہ ہوا اور وہ راستے میں کسی مکان میں گئی اور اس کو ولادت ہوگئی اور بچہ دوبار رویا اور فوت ہوگیا، حضرت عمرؓ نے متعدد صحابہ کرام کو جمع کر کے رائے لی کہ اس صورتِ حال کا کیا حکم ہے (کیا میرے اوپر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے)؟ سب نے کہا کہ آپ والی ہیں نگرانی اور تادیب آپ کی ڈیوٹی ہے (آپ نے اپنا واجب ہی ادا کیا ہے) لہٰذا آپ کے ذمہ کچھ نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مجلس میں موجود تھے اور خاموش تھے حضرت عمرؓ نے ان سے بھی پوچھا، انھوں نے فرمایا کہ ان لوگوں نے اگر سوچ سمجھ کر رائے دی ہے تو ان سے (معاملہ فہمی میں) غلطی ہوئی ہے اور اگر انھوں نے محض آپ کو خوش کرنے کے لئے یہ رائے دی ہے تو آپ سے (حقیقی) خیر خواہی نہیں کی، میری رائے یہ ہے کہ اس کی دِیَت آپ کے ذمہ ہے کیونکہ آپ نے ہی اُس کو خوف زدہ کیا تھا (اور اسی کی وجہ سے بچہ کی جان گئی) چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسی رائے پر فیصلہ کیا[1]۔

حضرت عمرؓ چاہتے تو اکثریت کی رائے پر فیصلہ کر سکتے تھے جو ان کے حق میں بظاہر بہتر تھی مگر انھوں نے حضرت علیؓ کے دشوار فیصلہ کو اختیار کیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے رات کے پہرے میں ایک عورت مرد کو فاحشہ میں مبتلا دیکھا صبح کو اہل رائے حضرات سے مشورہ کیا کہ اگر امام کسی عورت مرد کو فاحشہ میں مبتلا دیکھے اور وہ ان پر حد (یعنی شرعی سزا) جاری کر دے تو بتاؤ تم کیا کرو گے؟

---

[1] ایضاً ۲: ۲۲۳-۲۲۴، عن مصنف عبدالرزاقؒ والبیہقیؒ۔

ماکنتم فاعلین؟

انھوں نے جواب دیا: اِنما انت اِمام، جس کا ٹھیک ٹھیک لفظی ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ "آپ تو صرف امام ہیں"۔ اس جواب کا حاصل یہی ہوا کہ یہ کام آپ کا نہیں ہے، لیکن بات صحیح ہونے کے باوجود ذرا گول مول ہے، اہل مشورہ حضرات میں حضرت علیؓ بھی تشریف فرما تھے انھوں نے فرمایا:

"لیس ذلک لک (آپ کو اس کا حق نہیں ہے) (اگر آپ نے ان کے متعلق یہ بات زبان سے نکال دی اور آپ ان کے خلاف چار گواہ نہ پیش کر سکے تو) اِذن یقام علیک الحد، اِن اللہ لم یأمن علی ھذا الاُمر اُقل من اُربعۃ شھداء، (اس صورت میں) خود آپ کے اوپر حد جاری کی جائے گی (تہمت لگانے کی سزا دی جائے گی) اللہ تعالیٰ اس معاملے میں چار گواہوں سے کم پر مطمئن نہیں ہوا۔

راوی کا بیان ہے کہ کچھ ٹھہر کر حضرت عمرؓ نے ان حضرات سے پھر یہی مشورہ چاہا تو ان لوگوں نے وہی جواب دیا جو پہلے دے چکے تھے، اور حضرت علیؓ نے بھی وہی بات دہرائی جو پہلے کہی تھی[1]۔

آپ ان واقعات پر ایک نگاہ پھر ڈال لیجئے، رائے کے یہ اختلافات اور حضرت عمرؓ کے سامنے حضرت علیؓ کی یہ صاف گوئی اور لب ولہجے کی یہ بے باکی اور اس سب کے باوجود کبھی حضرت عمرؓ کے دل میں ان کی طرف سے کوئی میل نہیں آیا بلکہ کئی بار ایسے ہی مواقع پر حضرت عمرؓ نے کھلے لفظوں میں یہ تسلیم کیا کہ لولاَ علِیّ لھلک عمر[2] (اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو گیا تھا۔ یعنی ایک غلط فیصلے کے نتیجے میں ایک مؤمن کی جان میرے ہاتھوں ضائع ہوئی جا رہی تھی) اور ہمیشہ اہم معاملات میں ان سے مشورہ کرتے

---

[1] کنز العمال ۵:۲۵۶۔ [2] حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

رہے، حضرت علیؓ کی اہمیت کا انھوں نے یہاں تک اعتراف کیا کہ متعدد مواقع پر فرمایا:

"میں ایسی مُعضِلَۃ (گتھی) سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں جسے
سلجھانے کے لئے ابوالحسن (علیؓ) موجود نہ ہوں"[۱]

اور دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما سے محبت اور ان کی عظمت کا حال یہ ہے کہ ایک شخص نے آپ کو یہ کہہ کر مخاطب کیا کہ:

"اے رسول اللہ کے بعد سب سے زیادہ محترم ہستی!"

تو حضرت علیؓ نے فرمایا:

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ محترم تو ابوبکرؓ اور عمرؓ ہیں"[۲]

گزشتہ صفحے کا حاشیہ —

[۱] حافظ ابن عبدالبرؒ نے کتاب الاستیعاب ۲: ۲۹، میں یہ مقولہ اور آئندہ مقولہ دونوں نقل کئے ہیں علامہ زمخشریؒ نے اپنی کتاب "الموافقۃ بین أھل البیت والصحابۃ" میں ایک مستقل باب حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے باہمی تعلقات کا قائم کیا ہے ــــــ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ازالۃ الخفاء ۲: ۲۶۸ (فارسی طبع اول) میں یہ دونوں مقولے نقل کئے ہیں ان کے علاوہ یہ پہلا مقولہ نحو کی کتابوں ــــــ (نحومیر، ہدایۃ النحو وغیرہ) میں اور بلاغت و معانی کی کتابوں (مختصر المعانی وغیرہ) میں بھی "لَولَا" کے موقع استعمال کے بیان میں ذکر کیا جاتا ہے۔

الاستیعاب میں اور نحومیر ص۲۴، اور ہدایۃ النحو کے حواشی میں (ص۱۱۹) اس سلسلے میں ایک حاملہ عورت کے رجم کا واقعہ ہے اور مختصر المعانی کی بعض شروح میں ایک شخص کو ایک مغالطہ کے تحت حضرت عمرؓ کے گرفتار کر لینے اور حضرت علیؓ کے اس کے خلاف دلائل دینے کے بعد چھوڑ دینے کا واقعہ بھی درج کیا گیا ہے، ان دونوں واقعات میں حضرت علیؓ کے دلائل سے متاثر ہو کر حضرت عمرؓ نے یہ جملہ کہا تھا۔

---

[۱] اس مقولے کے حوالے اوپر والے حاشیہ میں بھی درج ہو چکے ہیں انکے علاوہ یہ مقولہ طبقات ابن سعد ۴: ۱۵۶، الاصابۃ ۲: ۵۰۹، میں اور طبقات کے حوالے سے حیاۃ الصحابۃ (عربی ۲: ۹۱، میں بھی ذکر کیا گیا ہے اور یہ دونوں مقولے کان یقول ماضی استمراری (کہا کرتے تھے) کے صیغے سے بیان کئے گئے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بار بار یہ جملے دہرایا کرتے تھے۔

[۲] مجمع الزوائد ۹: ۵۲ —

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے دور میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ رائے کے اختلاف کے باوجود ان کے دلوں میں کوئی اختلاف اور دوری نہ تھی اور ان اختلافات کی وجہ سے ان کے باہمی اتحاد اور اسلامی اخوت میں کمی نہیں آتی تھی اور جس کا جو حق ہے وقتی باتوں کی وجہ سے اس کو کبھی وہ فراموش نہ ہونے دیتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان جو معرکہ ہوا جو تاریخ میں جنگِ جمل کے نام سے مشہور ہے جس میں دونوں طرف کے بہت سے لوگ شہید ہو گئے اس جنگ کے ختم ہوتے ہی حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ کی مزاج پرسی کرنے آئے اور چند دن بصرے میں آرام و آسائش سے قیام کرایا اور اس کے بعد ان کے بھائی محمد بن ابی بکرؓ کے ہمراہ انھیں مدینہ منورہ بھیجا اور بصرے کی چالیس معزز خواتین کو پہنچانے کے لئے ان کے ساتھ بھیجا، حضرت عائشہؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ "ہماری باہمی کشمکش محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی ورنہ مجھ میں اور علیؓ میں پہلے سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔ حضرت علیؓ نے بھی مناسب الفاظ میں تصدیق کی اور فرمایا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم اور ہماری ماں ہیں ان کی تعظیم و توقیر ضروری ہے[1]

حضرت عائشہؓ نے ایک بار لوگوں سے پوچھا کہ بتاؤ عاشوراء کے روزے کے متعلق سب سے زیادہ علم کسے ہے؟ لوگوں نے کہا: حضرت علیؓ کو فرمایا: ہاں علیؓ کو ہے اور پھر فرمایا أما إنه لأعلم الناس بالسنة (پوری سنت یعنی حدیث نبوی کے متعلق بھی تمام لوگوں سے زیادہ وہی صاحب علم ہیں[2])

ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے موزوں پر مسح کرنے کے متعلق کوئی بات پوچھی تو انھوں نے فرمایا: ایتِ علیًا فاسأله (علیؓ کے پاس جاؤ اور ان سے معلوم کرو[3])

---

[1] خلفائے راشدین ص۲۹۴ (۱۹۸۴ء دار المصنفین)

[2] الاستیعاب ۳: ۴۰۔

[3] ایضاً ۲: ۴۳۔

طوالت کا خوف دامن گیر ہے ورنہ صحابہ وتابعین اور اسلاف کے ایسے واقعات سے سیرت وسوانح کی کتابیں بھری ہوئی ہیں کہ سخت اختلافات کے باوجود وہ نہ کبھی ایک دوسرے کی خوبیوں کا اعتراف کرنے میں ہچکچاتے تھے، نہ ایک دوسرے کی عظمت واحترام میں کوئی کمی کرتے تھے۔ اور نہ ہی کبھی حق وانصاف کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹتا تھا۔

ایک روز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رات میں حضرت عَلْقَمہ بن عُلاثہؓ سے ملنے گئے حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ بن ولید ایک دوسرے سے بہت مشابہ تھے (علقمہ اندھیرے میں پہچان نہ سکے اور ان کو خالدؓ بن ولید سمجھ کر فوراً بات شروع کر دی کہ)

"خالد! آخر اس شخص (مراد حضرت عمرؓ) نے تمھیں معزول کر ہی دیا، اس کا مقصد تم سے پرانی دشمنی نکالنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے، میں اور میرا چچازاد بھائی، ان کے پاس ایک ضرورت سے گئے تھے لیکن اب جبکہ انھوں نے یہ اقدام کر ڈالا ہے ہم ان سے کچھ طلب نہیں کریں گے۔"

حضرت عمر رضی اللہ نے (خود کو ظاہر کئے بغیر گویا حضرت خالدؓ بن ولید ہی کی طرف سے) پوچھا: تو کہو پھر تم اب کیا کر سکتے ہو؟ (اس سوال کے جواب میں حضرت علقمہؓ بن عُلاثہ رضی اللہ عنہ نے جو بات کہی وہ تو از ن فکر، ملی اتحاد، اسلامی معاشرت کی یکجہتی اور خدا ورسول سے وفاداری کے موضوع پر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے)

انھوں نے جواب دیا: هُم قوم لهم علينا حق فنُؤدّى لهم حقّهم وأجرنا على الله۔ ان لوگوں (امراء وُوُلاۃ) کا ہم پر ایک حق ہے (کہ ہم ان کی تابعداری کریں) بس ہم ان کا حق ادا کرتے رہیں اور ہمارا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں مل جائے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب ان سے پوچھا کہ پھر تم کیا کہتے ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا: ما عندى إلا السمع والطاعة میں سننے اور ماننے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر میرے پیچھے سب

لوگ اسی ذہن و خیال کے ہوں تو یہ بات مجھے فلاں فلاں عظیم نعمتوں سے زیادہ محبوب شے ہے[1]۔ یعنی رات کی تنہائیوں میں میری عدم موجودگی میں اس حد تک سمع و طاعت کا اور حق و انصاف کا لحاظ پاس ہونا معاشرے کے نہایت صالح اور پختہ کردار اور صاحبِ ایمان ہونے کی علامت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک درخت ہے اور فقہی احکام اور جزوی مسائل اس کی شاخیں اور پتیاں ہیں، ملت کے تمام افراد جس رشتۂ اُخوّت میں بندھے ہوئے ہیں وہ اصل اسلامی رشتہ ہے جو ایک بنیادی رشتہ ہے اس عظیم رشتے اور بنیادی بندھن پر اگر ان جزوی مسائل کا اختلاف اثر انداز ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے شاخوں اور پتیوں کو تنے اور جڑ کی برابر بلکہ ان سے بھی زیادہ اہمیت دے دی اور یہ بات دین و مذہب اور عقل و انصاف کے سراسر خلاف ہے۔ معاشرے کی اصلاح اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے قرآن مجید اور سنت نبوی میں کفر و شرک کے بعد جس چیز کی سب سے زیادہ شدید مذمت کی گئی ہے وہ یہی باہمی تفریق اور معاشرے کا بگاڑ ہے، اور جیسا کہ ہم ایک دوسرے کتابچے "اتحادِ ملت" میں لکھ چکے ہیں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرتی تعلقات کی درستی کو نماز روزہ جیسے ارکانِ اسلام سے بھی زیادہ اہم قرار دیا ہے، مسلمانوں کا آپس میں اس عظیم و بلند اور طاقت ور رشتے کو اِن جزوی اختلافات کی وجہ سے نظر انداز کرنا سخت غفلت اور بڑی حقیقت ناشناسی کی علامت اور احکامِ شریعت کے باہمی درجات و مراتب کو نہ پہچاننے کی دلیل ہے۔

کوفے کے بڑے عالم و محدث عمرو بن مُرّہؒ جو شعبہؒ، اوزاعیؒ اور سفیان ثوریؒ جیسے اکابرِ امت کے استاذ ہیں[2] ان کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے مسلمانوں

---

[1] الاصابۃ ۲: ۵۰۴، ذکر علقمہ بن عُلاثہ رضی اللہ عنہ۔

[2] دیکھئے تہذیب التہذیب ۸: ۱۰۲، ذکر عمرو بن مُرّۃ المرادی الکوفی۔

کے مختلف فرقوں سے اپنے وابستہ ہونے اور پھر ہر ایک کو دوسرے سے متصادم دیکھ کر بددل ہونے اور الگ ہو جانے کا ذکر کیا اور مشورہ چاہا کہ میں آخر کیا کروں ؟ اور کس کو حق اور کس کو ناحق سمجھوں ؟

انھوں نے پوچھا کہ بتاؤ کیا اُن میں سے کسی کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے میں اختلاف ہے ؟ کسی کو قرآن مجید کے کتاب الٰہی ہونے میں اختلاف ہے ؟ کیا اس میں کسی کا اختلاف ہے کہ روزانہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے ؟ رمضان کے روزے فرض ہیں، زکوٰۃ فرض ہے، حج فرض ہے ؟ وہ شخص ہر سوال کا جواب نفی میں دیتا رہا اس پر حضرت عَمرو بن مُرَّہؒ نے فرمایا:

"دیکھو یاد رکھو! جن مسائل میں تمام مسلمان متفق ہیں مُحْکَمَات[1] وہی ہیں انھی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور اختلافی مسائل میں زیادہ غور و خوض نہ کرو ان کی حیثیت مُتَشَابِہَات[2] کی ہے جن کا حقیقی علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے"۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر دَور میں اختلافی مسائل الگ الگ ہوتے ہیں کبھی تقدیر کا مسئلہ کبھی قرآن مجید کے مخلوق ہونے نہ ہونے کا مسئلہ اور کبھی حدیث کے حجت ہونے نہ ہونے کی بحثیں[3]۔ سورہ آل عمران کی جس آیت کے مفہوم کی طرف عمرو بن مُرَّہؒ نے اشارہ کیا ہے اسی میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور ٹیڑھ ہوتا ہے وہی لوگ متشابہات کے پیچھے پڑتے اور سوئے ہوئے فتنوں کو جگاتے پھرتے ہیں اور مشتبہ المراد نصوصِ شرع کی غلط تاویلیں کرتے پھرتے ہیں۔ لیکن سلیم الفطرت اور پختہ کارانِ

---

[1] واضح اور غیر مبہم جنکی مراد سمجھنے میں کوئی اشتباہ نہیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ محکمات آیتیں ہی قرآن مجید کا بنیادی اور اصل حصہ ہیں (سورۃ آل عمران : ۷) [2] مشتبہ المراد جن کا مفہوم کسی بھی وجہ سے غیر واضح اور مشتبہ ہے۔ [3] اور تو اور سلمان رُشدی کو اہانتِ رسول کے جرم میں قتل کر دیا جانا چاہئے یا نہیں؟ اس پر حال میں نئی دہلی میں دو حلقوں کی طرف سے دو کتابیں شائع ہو گئیں ایک حمایت میں ایک مخالفت میں، اور ہر دو کا استدلال کتاب و سنت ہی سے ہے۔

علم و بصیرت کی شان خدا تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ وہ کھود کرید اور بحث و تمحیص میں پڑے بغیر اجمالاً کہہ دیتے ہیں کہ ہم اللہ کی ہر بات پر ایمان لاتے ہیں، ان کا حقیقۃً جو بھی کچھ مفہوم ہو ہم اُسے تسلیم کرتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار اپنی قیام گاہ سے باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ کچھ لوگ مسئلہ تقدیر کی (نازک اور حساس) بحث میں الجھے ہوئے ہیں اور باہمی اختلاف نزاع کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے (ونحن نتنازع فی القدر) آپؐ یہ دیکھ کر سخت غضبناک ہوئے اور آپؐ کا چہرۂ انور سرخ انار ہو گیا (کأنما فُقئ فی وجہہ حبّ الرمّان حُمرۃٌ من الغضب) اور آپؐ نے ارشاد فرمایا: کیا تمہیں اسی بات کا حکم دیا گیا ہے؟ کیا میں تمہارے پاس اسی کام کے لئے بھیجا گیا ہوں؟ إنما هلك من كان قبلكم باختلافهم فی الکتاب[۱]۔ (تم سے پہلی قومیں اور ملتیں صرف کتابِ الٰہی میں اختلاف و نزاع کرنے کی وجہ سے ہی برباد کر دی گئیں۔)

ایک روایت میں مزید یہ بھی ہے کہ آپؐ اچانک ایسے وقت باہر تشریف لائے جس میں آنے کا معمول نہ تھا اور بتایا کہ مجھے جبریل علیہ السلام نے آکر بتایا ہے کہ تم لوگ اس طرح کی بحث میں پڑے ہوئے ہو[۲]۔

اہل قدر (تقدیر کے مسائل میں بحث کرنے والوں) کے متعلق آپ کا ارشادِ گرامی ہے کہ لا تجالسوا أهل القدر ولا تناتحوهم[۳]، اس لا تفاتحوهم کی تشریح "مجمع البحار" میں "لا تحاكموهم" کی گئی ہے[۴] یعنی نہ ان کے ساتھ نشست و برخاست رکھو اور نہ ان سے بحث مباحثہ کرو۔

---

[۱] الجامع الصغیر ۲: ۵۰۲ [۲] مجمع الزوائد ۷: ۲۰۱

[۳] مسند احمد ۱: ۲۲۳، ۲۴۲، رقم ۲۰۶، وابو داود، وابن حبان فی صحیحہ (موارد الظمآن ص ۴۵۱، رقم الحدیث ۱۸۲۵۔

[۴] ۴: ۹۱۔

اور دوسری حدیث میں ہے "المِرَاءُ فی القرآن کفر"[1] قرآن مجید میں بحث وجدال[2] کرنا کفر ہے، اسی لئے ایک حدیث میں تعلیم دی گئی ہے کہ:

لا یؤمن العبد الایمان کلہ حتیٰ یترك المِرَاءَ[3] وان کان صادقاً۔

کوئی بندہ ایمان پر اس وقت تک پورا پورا قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ حق پر ہوتے ہوئے بھی بحث وجدال کرنا نہ چھوڑ دے۔

ترمذی میں بسند حسن اور ابن ماجہ میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من ترك المِرَاءَ وھو مُحِقٌّ بُنِیَ لہ قصر فی وسط الجنۃ

جس نے بحث وجدال چھوڑ دیا حالانکہ وہ حق پر تھا اس کے لئے جنت کے بیچوں بیچ ایک محل تعمیر کر دیا جائے گا۔

اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بحث وجدال کا نتیجہ ہمیشہ دوری اور نفرت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے دو دوستوں اور قریبی عزیزوں تک میں بحث ومباحثہ نفرت کے بیج بو دیتا ہے تو دوسروں کا کیا ذکر، دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ بات جب بحث ومباحثے میں آجاتی ہے تو سمجھنے سمجھانے کا سچا جذبہ مغلوب ہو جاتا ہے اور اپنی اپنی بات منوانے کا جذبہ غالب آجاتا ہے جس کا انجام نہ صرف یہ کہ محنت ضائع ہونا ہوتا ہے بلکہ اس کا الٹا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہر فریق اپنے موقف کے لئے طرح طرح کے مزید دلائل فراہم کرنے لگتا ہے اور دلیل ملے نہ ملے ہر صورت میں اس میں ضد اور اڑ اور اپنی بات کی پیچ کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمدردانہ و دوستانہ افہام وتفہیم کے بجائے معاملہ کو بحث وجدال میں ڈال دینا مخاطب کو نادانستہ طور پر

---

[1] احمد، ابوداود، حاکم عن ابی ہریرۃؓ (الفتح الربانی ۱۹: ۲۶۸)

[2] المراء کے معنی شک کرنے کے بھی آتے ہیں اور بحث وجدال کے۔ سی یہاں دوسرے ہی معنی مراد ہیں۔

[3] مسند احمد ۲: ۳۵۲-۳۶۴۔

اپنی رَوِش پر پختہ کر دینے کے مرادف ہے جو بڑا سنگین فتنہ ہے، لیکن ایسے معاملات میں مخاطبین ہی میں نہیں بلکہ خود سمجھانے والوں میں بھی نفسانیت آ جاتی ہے جس سے بچنا سخت دشوار کام ہے اس لئے بحث و جدال سے بچنے پر بہت بڑی خوشخبری دی گئی ہے۔

ایک حدیث نبوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ بحث و جدال ہمیشہ اُنھی قوموں کا مقدر بنا کرتا ہے جن کو پہلے آسمانی ہدایت عطا کی گئی ہو اور وہ اس سے بھٹک گئی ہوں ماضلّ قوم بعد هدی کانوا علیہ إلاأوتوا الجدل۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم عن ابی اُمامہؓ)[1]

امام حارث محاسبیؒ (متوفی ۲۴۳ھ) نے نصیحت کی ہے کہ "میرے بھائی! دین کے بارے میں بحث و جدال سے سخت پرہیز کرو"[2]

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور اس وقت کے چلے ہوئے جدید و قدیم علوم میں کمال پیدا کیا تھا، فلسفہ کی معراج حاصل کی تھی اور پھر اس پر زبردست حملے بھی کئے تھے وہ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"اس حدیث میں انھی خلافیات اور بحث و جدال کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے ہمارے دور میں جنم لیا ہے جس کے نتیجے میں نت نئی تحریریں اور ایک سے ایک مجادلے اور تصانیف سامنے آتی رہتی ہیں، پس خبردار! ان چیزوں کے پاس بھی نہ پھٹکو، اور ان سے اس طرح بچو جیسے سمِ قاتل اور مہلک بیماری سے بچتے ہو، یہی وہ (لعنت) ہے جس نے تمام فقہاءِ (زمانہ) کو فخر و مباہات میں مبتلا کر دیا، ایسے لوگوں کی بات ہرگز نہ سنو، لوگ جس چیز کو جانتے نہیں اس کے دشمن ہوتے ہیں تم اس وقت ایک بہت باخبر انسان[3] سے ہم کلام ہو اس لئے اس کی نصیحت کو یاد رکھو، اس نے انھی تمام افعال میں اپنی عمرِ عزیز کا ایک بڑا حصہ ضائع کیا ہے اور اس نے بھی خود مجادلین اوّلین کی کتابوں پر اپنی تصانیف

---

[1] الجامع الصغیر ۵: ۴۵۲

[2] رسالۃ المسترشدین ص ۷۰-۸۰، (قاہرہ ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۲ء)

[3] یعنی خود امام غزالیؒ۔

کے اضافے کئے ہیں اور دادِ تحقیق دی ہے اور جدل و ثبات کی وادیوں میں پھرتا رہا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اسے راہ ہدایت سُجھائی اور اپنے غیبی علوم سے بہرہ ور کیا اور پھر اس نے ان تمام مشاغل کو خیر باد کہہ دیا۔"[1]

اس لئے عافیت کی راہ یہی ہے کہ کسی مسئلے میں خواہ کتنی ہی تحقیقی بات معلوم ہو آدمی بحث و جدال ہرگز نہ کرے اور تمام اہلِ ایمان سے سچی اور پُر خلوص محبت رکھے اور رائے کے فرق کے باوجود اُن سے معاشرتی تعلقات قائم رکھے ماضی بعید میں بھی اور ماضی قریب میں بھی ملّت کے بہت سے خادموں نے اس نسخے پر عمل کیا ہے اور اِس ناچیز نے ذاتی طور پر بھی اس کا خوب تجربہ کیا ہے کہ مسلک کے واضح فرق کے باوجود اگر آدمی بحث و مباحثہ سے بچتے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں سے میل جول اور معاشرتی تعلقات برقرار رکھے تو نہ صرف یہ کہ بہت سی غلط فہمیاں ختم ہو جاتی ہیں بلکہ باہمی تعاون کی نئی راہیں کھلتی ہیں اور خود متنازعہ مسائل کے بارے میں بھی ایک دوسرے کے لئے گوشۂ نرم اور جذبۂ ہمدردی پیدا ہوتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں مسلمانوں کو آپس کے بہت سے حقوق اور معاشرتی آداب تعلیم فرمائے ہیں جن کا ادا کرنا بہرحال ضروری ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے ان حقوق میں سے کوئی چیز بھی چھوڑ دی اس نے ایک حق واجب چھوڑ دیا[2] اور بعض احادیث میں ان حقوق کے متعلق یہ بھی ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ لایبرأ منها إلا بالأداء والعفو[3] ——— (مومن ان حقوق کو ادا کئے بغیر یا معاف کرائے بغیر بَری نہیں ہو سکتا۔) جب ہم ایک شخص کے بارے میں یہ جانتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا، اور خواہ اس کا تعلق ملّت کے کسی

---

[1] فیض القدیر ۵: ۴۵۳-۴۵۴۔

[2] الترغیب ۳: ۲۴۰

[3] فیض القدیر شرح الجامع الصغیر ۳: ۲۹۰-۲۹۱۔

بھی طبقہ سے ہو ہمارے ذمہ محض اسلامی رشتے کی وجہ سے اس کے بہت سے حقوق
عائد ہو جاتے ہیں ہماری جو 'انا' جو حمیّت اور جو بھی مصلحت اس کا حق ادا کرنے سے
مانع ہے وہ جاہلی عصبیّت اور شیطانی مکروفریب ہے خواہ وہ تاویل و توجیہ کے
رنگین آبگینے میں کتنا ہی خوبصورت نظر آرہا ہو اور خواہ اس پر "حمایتِ حق" اور "فتنہ و شر
سے پرہیز" وغیرہ کا کیسا ہی ملمع چڑھا دیا گیا ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد جب بھی مکہ مکرّمہ تشریف لے گئے تو قصر نماز
پڑھی یہی طریقہ حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کا اپنی اپنی خلافتوں
کے زمانے میں رہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے ابتدائی دور میں اسی پر
عمل کیا لیکن پھر حضرت عثمانؓ نے (چار رکعت والی نمازیں) چار ہی پڑھنا شروع کر دیں،
یہ بات جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوئی تو انھوں نے کہا انا للہ
وانا الیہ راجعون، گویا ناپسند کیا کہ حضرت عثمانؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
لے کر آج تک کی روش کی خلاف ورزی کر رہے ہیں مگر جب جماعت کھڑی ہوئی
تو حضرت عثمانؓ کے پیچھے انھوں نے بھی کھڑے ہو کر چار ہی رکعتیں پڑھیں۔ لوگوں
نے کہا: آپ نے چار رکعت کے نام پر انا للہ بھی پڑھی اور پھر خود آپ نے بھی چار ہی
رکعتیں پڑھ لیں؟ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا الخلاف شر[1] (اختلاف
بہت بری چیز ہے)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار رکعت کیوں پڑھی تھیں یہ ایک بالکل الگ
فقہی مسئلہ ہے جس کی ان کے پاس دلیل تھی، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ
حضرت ابن مسعودؓ اس کی وجہ نہ جانتے ہوئے بھی محض اختلاف و انتشار سے بچنے
کی خاطر خاموشی سے ان کے عمل میں شریک ہو جاتے ہیں۔

بالکل یہی قصہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا ہے انھوں نے بھی جب

---

[1] حیاۃ الصحابۃ ۲: ۹۹۔

یہ سنا کہ حضرت عثمانؓ نے یہاں مکہ مکرمہ میں آکر چار رکعتیں پڑھی ہیں تو انھوں نے سخت اختلاف کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو پڑھیں ابو بکرؓ و عمرؓ کے ساتھ دو پڑھیں یہ چار پڑھنے لگے! لیکن جب جماعت کھڑی ہوئی تو انھوں نے بھی چار ہی پڑھیں، لوگوں نے اسی طرح اُن سے بھی سوال کیا تو اُنھوں نے فرمایا: الخلافُ اشدُّ[1] (اختلاف اس سے بھی زیادہ بُری چیز ہے۔)

اور یہ دَور تو خیر صحابۂ کرام کا مقدس دور ہے اس کے بعد بھی اکابر ائمہ کا طرز عمل کبھی تشدد کا نہیں رہا وہ ہمیشہ باہمی محبت اور اخلاق و مروت اور اسلامی رشتے کے احترام کو ان جزوی اختلافات سے بلند ہی رکھتے رہے، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن فجر کی نماز حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرے کے قریب ادا کی تو قنوت نہیں پڑھی جبکہ ان کے یہاں فجر کی نماز میں اس کی تاکید ہے اور وجہ پوچھنے پر بتایا کہ میں نے ان صاحبِ قبر کے احترام میں ایسا کیا ہے[2]۔ اور فرمایا: ہم کبھی کبھی اہل عراق کا مسلک اختیار کر لیتے ہیں[3]۔ یعنی امام ابو حنیفہؒ کا مسلک۔

امام ابو یوسفؒ جو امام ابو حنیفہؒ کے خاص شاگرد ہیں انھوں نے ایک بار جمعہ کی نماز پڑھائی نماز کے بعد سب لوگ نکل گئے بعد میں پتہ چلا کہ امام ابو یوسفؒ نے جس حمّام میں جمعہ سے قبل غسل کیا تھا اس کی ٹنکی میں چوہا مرا ہوا پڑا ہے، تو انھوں نے فرمایا: إذاً نأخذ بقول إخواننا من أهل المدينة : إذا بلغ الماء قُلّتين لم يحمل خبثا (چلو ہم اپنے اہل مدینہ بھائیوں کی رائے مان لیتے ہیں کہ جب پانی دو مٹکے کی مقدار میں ہو تو ناپاک نہیں ہوتا[4])۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جسم سے خون نکلنے سے وضو ٹوٹ

---

[1] مجمع الزوائد ۵: ۲۱۶۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ ۱: ۱۵۹، وغیرہ

[3] ایضاً۔

[4] ایضاً۔

جاتا ہے جبکہ امام مالکؒ اور سعید بن المسیبؒ اس سے وضوء ٹوٹنے کے قائل نہیں ہیں ، لیکن ہارون رشید نے وضوء کی حالت میں پچھنے لگوائے اور امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق دوبارہ وضو کئے بغیر نماز پڑھائی اور امام ابو یوسفؒ نے ان کے پیچھے نماز ادا کی اور بعد میں لوٹائی بھی نہیں[1]۔

امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے پوچھا کہ اگر امام کے جسم سے خون نکل آیا ہو اور وہ دوبارہ وضو کئے بغیر نماز پڑھائے تو آپ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں گے؟ تو انھوں نے جواب دیا: کیف لا اُصلی خلف الامام مالکؒ وسعید بن المسیبؒ؟ (میں امام مالکؒ اور سعید بن المسیبؒ (جیسی ہستیوں) کے پیچھے کیسے نہ نماز پڑھوں[2]؟)

ظاہر ہے کہ ایسی مثالوں کو زندگی کا عام دستور نہیں بنایا جا سکتا اور نہ ان واقعات کا سہارا لیکر کسی کو سہولت پسندی، حیلہ جوئی اور احکامِ شرع کو کھیل بنا لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے، ہاں ان واقعات سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اختلافات نزاع کی بنیاد نہیں ہیں۔ عبادات میں اصل چیز جذبۂ طاعت و فرماں برداری ہے اگر وہ پایا جا رہا ہے تو اس کی عملی شکل کے متعلق ائمۂ اسلام کے اختلافات کو پریشانی کا باعث نہ سمجھنا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگو! فرماں برداری کو اپنا شیوہ بنالو اور اجتماعیت کو قائم رکھے رہو یہی اللہ تعالیٰ کی وہ محکم رسی ہے جسے مضبوط پکڑے رہنے کا اس نے حکم دیا ہے (اِنّ ما تکرھون فی الجماعۃ خیر مما تحبون فی الفرقۃ) (تمہیں اجتماعیت میں جو کوئی بات بُری نظر آتی ہے وہ اس بھلائی سے بہت بہتر ہے جو تمہیں افتراق و انتشار میں نظر آتی ہے[3]) یعنی اجتماعیت کو بہت سی خرابیوں کی قیمت پر بھی برقرار رکھنا ضروری ہے اور افتراق و انتشار کو بہت سی خوبیوں کی قیمت پر بھی ہرگز گوارا نہیں کرنا چاہیے۔

---

[1] [2] ایضاً [3] مجمع الزوائد: ۲۲۲۔

غرض یہ کہ اس قسم کی شرعی ہدایات صحابۂ کرام کے باہمی معاملات اور علماء اسلام کی راہوں اور ان کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے ہم جب اپنی معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو اپنی بہت سی کمزوریاں نظر آتی ہیں اور اس معاملے میں بڑی غفلت معلوم ہوتی ہے کہ ایک ہی کتاب و سنّت اور ایک ہی علم و استدلال صرف ذہن اور طرزِ فکر کے فرق سے ان حضرات کو اتحاد و یک جہتی کی طرف لے جاتا تھا اور وہی علم و استدلال ہمیں ملّت کے ٹکڑے کرنے کی طرف لے جاتا ہے، عارفِ کامل مولانا جلال الدین رومیؒ نے فرمایا ہے کہ باز کے پاس بھی دو ہی بازو ہیں جو اسے شاہی ایوانوں تک رسائی بخشتے ہیں اور کوّے کے پاس بھی دو ہی بازو ہیں جو اُسے مقابر (اور ویرانوں) میں لے جاتے ہیں ؎

بالِ بازاں را سوئے سلطان بُرد　　　بالِ زاغاں را بگورستاں بُرد

بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

پرواز ہے دونوں کی اِسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

حقیقت یہ ہے جیسا کہ مشہور محدث وَکیع بن الجَرَّاح رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۷ھ) نے کہا ہے کہ "علم شریعت اِک خدائی نور اور سرچشمۂ نبوت کا مقدس فیضان[1] ہے" اور اس

---

[1] محدث علی بن خشرمؒ نے اپنے استاد وکیعؒ سے شکایت کی کہ میری یادداشت بہت کمزور ہے جو کچھ پڑھتا ہوں بھول جاتا ہوں، استاد نے یادداشت کا کوئی نسخہ بتانے کے بجائے نصیحت کی کہ "گناہوں سے پرہیز کرو، علم (شریعت) خدائی نور ہے اور یہ نور گنہگار کو نہیں بخشا جاتا"۔
بعض شعراء نے استاد اور شاگرد کی گفتگو کو ان دو شعروں میں نظم کیا ہے ؎

شکوتُ إلی وکیعٍ سوءَ حِفظی　　　فأرشدنی إلی ترکِ المعاصی
فإنّ العلمَ نورٌ من الٰہٍ　　　ونورُ اللہِ لا یُعطی لعاصی

حافظ ابن حجرؒ نے یہ مکالمہ اختصار کے ساتھ تہذیب التہذیب ۱۱: ۱۲۹ میں نقل کیا ہے اس میں یہ اشعار نہیں ہیں تعلیم المتعلم میں اشعار بھی ذکر کئے گئے ہیں۔

نورِ الٰہی کا صحیح مقام کائناتِ بدن میں صرف قلب ہے، اگر علم شریعت کو قلب میں پیوست کیا جائے تو یہ علم اس کے حامل کے لئے بھی اور اللہ کی دوسری مخلوق کے لئے بھی رحمت بنتا ہے، اور اسی علم کے حامل اولیں کو رحمۃ للعالمین کے مقام رفیع پر سرفراز فرمایا گیا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اگر اس علم کو نفس کا ساتھی اور طبعی رجحانات اور نفسانی جذبات کی تکمیل کا ذریعہ بنالیا جائے تو وہ خود اس انسان کے لئے بھی وبال جان بنتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی ؎

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دِل زنی یارے بُوَد[1]

ملّت میں عوامی سطح پر معاشرتی حقوق کی بے احتیاطی اور خواص کی سطح پر معاشرتی حقوق میں غفلت کے ساتھ ساتھ علمی استدلال کے مغالطوں اور راجح کو مرجوح اور مرجوح کو راجح قرار دینے اور جڑ کو شاخوں اور پتّیوں کے اور شاخوں پتیوں کو جڑ کے مقام پر رکھنے کی بے احتیاطیوں اور سب سے بڑھ کر ملت کی بیماریوں کے صحیح اور مناسب علاج کی تدابیر میں کوتاہی نے اور ان کے علاوہ بہت سے گفتنی و ناگفتنی عوامل نے ملت کے طبقات میں مختلف النوع غلط فہمیاں، گوناگوں بے اعتمادیاں اور دوریاں پیدا کردی ہیں۔

ملّت کے ایک بڑے مُصلح اور ممتاز عالم و بزرگ تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے اپنے ایک رفیق کے نام خط میں لکھا تھا کہ:

"ایک دوسرے کے ساتھ عزت و حرمت[2] اور محبت کو ہر چیز سے بہتر سمجھتے رہیں، ہزار مسائل حقہ کی حمایتوں سے اس ایک حق کی نگہداشت اور اس پر پختہ ہونا افضل و اعلیٰ اور مُوجِب رضائے خداوندی ہے۔"[3]

---

[1] مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں: علم کو اگر نفس سے وابستہ کرو گے تو سانپ ہوگا اور اگر علم کو دل کی زینت بناؤ گے تو دوست بنے گا۔ [2] "حرمت" احترام۔

[3] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۱۱۲۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت　　وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

اس لئے ملت کے مختلف طبقات کے درمیان فاصلے گھٹانے اور ہر ایک کو دوسرے سے قریب لانے کی بہت سی تدبیروں میں سے ایک اہم تدبیر اور علاج یہ بھی نظر آتا ہے کہ ملت کے ہر طبقے کے لوگ دوسرے طبقات سے معاشرتی تعلقات اور میل جول بڑھائیں مثال کے طور پر ایک طبقے کا کوئی اہم شخص خدانخواستہ بیمار ہے تو دوسرے طبقے کے لوگ بالخصوص اس کے نمایاں لوگ اس کی مزاج پرسی کریں جو ایک شرعی اور معاشرتی حق ہے، یا کسی کے یہاں موت ہوگئی ہے تو جنازے میں شرکت کریں جو ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے اور حدیث شریف میں اس کی تاکید وارد ہوئی ہے، کسی کے یہاں کوئی تقریب ہو تو وہ دوسرے طبقے کے لوگوں کو اپنے یہاں مدعو کرے اور دوسرے طبقے کو چاہئے کہ وہ ان کی دعوت قبول کریں، ایک دوسرے کی خوشی کے موقع پر ان کو مبارک باد دیں، کسی کو ہماری کسی مدد کی ضرورت ہو کسی کو ہماری سفارش کی ضرورت ہو یا ہماری تھوڑی سی توجہ سے کسی کا کوئی کام بنتا ہو تو اسلامی اُخوت و ہمدردی کی خاطر اس کی مدد کریں، ہر طبقے کے معزز و محترم لوگوں کا اکرام کریں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو تعلیم دی ہے کہ: إذا أتاكم كريم قوم فأكرموه[1]، جب تمہارے پاس کسی قوم کا کوئی معزز آدمی آئے تو اس کا اکرام کیا کرو۔

اسی کے ساتھ ساتھ اُن تمام چیزوں سے پرہیز کیا جائے جن سے باہمی فاصلے بڑھ سکتے ہیں اور دلوں میں دوری پیدا ہوتی ہے مثال کے طور پر:

---

[1] یہ حدیث متعدد کتبِ حدیث میں کئی صحابہ کرام کے حوالے سے نقل کی گئی ہے (دیکھئے المعجم الکبیر ۲: ۲۰۴ حدیث نمبر ۲۲۶۶، ۲: ۳۲۵ حدیث نمبر ۲۲۵۸۔ حلیۃ الأولیاء ۶: ۲۰۵، مستدرک حاکم ۴: ۲۹۲، تاریخ بغداد للخطیب ۷: ۹۴، الکنیٰ للدولابی ۱: ۲۱، البدایۃ والنہایۃ ۵: ۷۸، مجمع الزوائد ۴: ۲۲۲، ۸: ۱۶،۱۵ وغیرہم

(۱) ایک دوسرے کے متعلق غلط فہمیاں نہ پیدا ہونے دیں ایسے ہر طرزِ عمل سے احتیاط کریں جس سے کسی کو غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرزِ عمل سے اس کی بہت عمدہ تعلیم دی ہے آپؐ اپنی ایک اہلیہ سے بات چیت کر رہے تھے دو انصاری صحابہؓ برابر سے گزرے تو آپؐ نے ان کو روک کر ارشاد فرمایا: إنها صفيّةُ (یہ میری اہلیہ صفیہؓ ہیں) انھوں نے تعجب سے عرض کیا سبحان اللہ! یعنی حیرت ہے کیا آپؐ کے متعلق کبھی کچھ اور بھی سوچا جا سکتا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: إن الشيطان يجري من ابن آدم مجرى الدم[1] (بلاشبہ شیطان آدمی کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے) یعنی ممکن تھا شیطان تمھیں کسی بدگمانی میں مبتلا کر دیتا۔

اسی طرح اس کی بھی احتیاط کرنی چاہئے کہ ہم خود کسی کے متعلق بدگمانی نہ کریں اور جہاں تک ممکن ہو دوسرے کے بارے میں اچھا ہی گمان رکھیں بالفرض اگر وہ برا ہوا تو اللہ خود ہر ایک کو دیکھنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے یا أیها الذین آمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن إن بعض الظن إثم[2]۔ اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! بہت سے گمانوں سے بچا کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

(۲) کسی کے متعلق کوئی بات سننے میں آئے تو جب تک تحقیق نہ ہو جائے اس پر یقین نہ کریں ہمیں قرآن مجید نے اس کی تاکید فرمائی ہے اور تنبیہ کی ہے کہ اگر ایسا نہ کروگے تو غلط اقدام کر گزروگے اور پھر اپنے کئے پر شرمندگی اٹھانی پڑے گی (الحجرات آیت ۶)۔

(۳) ایک دوسرے کے متعلق ہر آدمی اپنی زبان بند رکھے۔ (الحجرات آیت ۱۲)

(۴) ایک شخص کی غلطی کو بس اس کی ذات تک محدود سمجھا جائے جس نے جو غلطی کی ہے وہی اس کا ذمہ دار ہے لا تزر وازرة وزر أخرى (کوئی شخص کسی

---

[1] احیاء العلوم ۲: ۱۷۸ مع تخریج العراقیؒ، الجامع الصغیر مع شرح المناوی ۲: ۳۵۸۔

[2] سورۂ حجرات: ۱۲۔

دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (سورۃ النجم: ۳۸) کسی ایک فرد کی غلطی کو خواہ وہ فرد کتنا ہی عظیم ہو کسی گروہ کی اجتماعی غلطی کا رنگ نہ دیا جائے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اوپر قاتلانہ حملہ کرنے والے جب پکڑ لئے گئے تو دونوں نے اپنے اپنے وقت پر یہ تاکید کی تھی کہ میرے قتل کے بدلے صرف میرے قاتل کو ہی قصاص میں قتل کیا جائے اور وہ بھی اس وقت جبکہ میں جاں بحق ہو جاؤں۔ حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اوپر حملہ میں تو بہت سے لوگوں کی سازش تھی۔

(۵) اُن تمام الفاظ والقاب واصطلاحات، ان تمام جملوں، مقولوں اور لطیفوں سے اور ایسے طرزِ گفتگو اور طرزِ تحریر سے پرہیز کیا جائے جس سے کسی بھی بھائی کی یا کسی بھی طبقے کی توہین ہوتی ہو، زبان و قلم کے وہ مخفی تیر و نشتر اور ذوقِ تکلم کے وہ لطیف اشارے کنائے جن پر ظاہری شریعت "گریبان گیر"[1] نہ ہو سکے وہ بھی اس علیم وخبیر سے مخفی نہیں جو گوشۂ چشم کے ادنیٰ اشاروں اور دل کے پوشیدہ رازوں تک سے باخبر ہے یعلم خائنة الاعین وما تخفی الصدور (سورۃ مؤمن: ۱۹) وہ مشہور حدیث جسے ہم میں سے ہر شخص اپنی تحریر و تقریر میں بیان کرتا ہے کہ مسلمان وہی ہے جس کی زبان سے اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں یہ تمام چیزیں اسی کے دائرے میں آتی ہیں۔

اور یہ احتیاط صرف عمومی مجالس اور پریس کے بیانات تک ہی محدود نہیں رہنی چاہئے بلکہ نجی مجالس تک کو اور اپنے دل و دماغ اور ذہن و فکر تک کو اس قسم کی باتوں اور ایسے خیالات سے پاک رکھنا ضروری ہے، یہ چیز صرف سوسائٹی کا تقاضہ یا معاشرے ہی کی ضرورت نہیں بلکہ ہمارے ایمان کا ایک اہم تقاضا ہے اور یہ قلب

---

[1] علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے ؎

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلّم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

وروح کی سنگین بیماریاں ہیں جن سے پرہیز کرنا ہر شخص کی اپنی ضرورت ہے، قرآن مجید میں ان چیزوں کو فسوق (بدعملی) اور ایمان کے منافی قرار دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ بئس الاسم الفسوق بعد الایمان (ایمان کے بعد فسوق کا تو نام بھی برا ہے)۔ اور جو لوگ اپنی گزشتہ بے احتیاطیوں پر نادم اور تائب ہو کر اپنی روش نہ بدل لیں ان کو قرآن مجید میں ظالم قرار دیا گیا ہے۔ (حجرات: ۱۱)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار ممبر پر تشریف لائے اور آپ نے بہت بلند آواز[۱] میں بڑے غصے سے لوگوں کو ان الفاظ میں مخاطب فرمایا: یا معشر من اسلم بلسانہ ولم یفض الایمان الی قلبہ (اے وہ لوگو جو زبان سے اسلام کا اقرار کرتے ہو اور ان کے دلوں میں ابھی ایمان جاگزیں نہیں ہوا ہے!) حالانکہ اس طرح مخاطب کرنے کی آپ کو کبھی عادت نہ تھی، اور پھر آپ نے حاضرین کو مسلمانوں کی غیبت کرنے، ان کو تکلیف پہنچانے، ان کی کمزوریوں اور پوشیدہ حالات کے پیچھے پڑنے ان کو (ان کی کوتاہیوں پر) عار دلانے اور ان کو برا بھلا کہنے سے پرہیز کرنے کی تاکید فرمائی[۲]۔

گویا یہ چیزیں ایمان کے منافی ہیں اور (معاذ اللہ) ایمان کے دل میں جاگزیں نہ ہونے کی علامت ہے۔ اور آپ نے صرف اس کی باطنی خرابی بیان کر دینے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ آپ نے اس کے دنیوی انجام بد سے بھی باخبر کر دیا کہ جو لوگ لوگوں کو ستانے اور ان کی

---

[۱] ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اسمع العواتق فی بیوتہا (آوازِ مبارک اس قدر بلند تھی کہ پردہ نشین خواتین نے اپنے گھروں میں (اس کی گرج) سن لی تھی۔ (ابویعلی عن البراءؓ ورجالہ ثقات۔ مجمع الزوائد ۸: ۹۲)۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ سخت غضبناک تھے اور اسی حالت میں آپؐ نے بہت بلند آواز میں خطبہ دیا۔ (مجمع الزوائد ۸: ۹۲ من بریدۃؓ)

[۲] یہ حدیث ترمذی میں بروایت ابن عمرؓ، ابویعلی میں بروایت براء بن عازبؓ اور طبرانی میں بروایت ابن عباسؓ اور بروایت بریدۃؓ منقول ہے۔ (مشکوٰۃ ص ۱۴۰۲ حدیث نمبر ۵۰۴۴، مجمع الزوائد ۸: ۹۲، ۹۴)۔

کمزوریوں کی ٹوہ میں لگنے سے باز نہیں آئیں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی کمزوریوں کی ٹوہ میں لگ جائے گا اور اللہ تعالیٰ جس کی ٹوہ میں لگتا ہے اُسے ذلیل و خوار کئے بغیر نہیں چھوڑتا چاہے وہ اپنے گھر کے نہاں خانوں میں کیوں نہ محفوظ ہو[1]۔

آج ہم کھلی آنکھوں ان حالات کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ایک طبقے کے چند غیر محتاط لوگ جب اپنے حریف کو رسوا کرنے کا سامان کرتے ہیں تو قدرت کے غیبی ہاتھ خود ان کے لئے بھی حالات کو اس انداز سے بنا کر لاتے ہیں کہ تحفظ و پیش بندی کی ہزار تدبیروں کے باوجود ان کو بھی کسی نہ کسی شکل میں ذلت و خواری کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ کما تدین تدان، جیسا کرو گے ویسا بھرو گے[2]۔

(۶) ہر فردِ ملت سے خوش خلقی سے پیش آنا چاہئے خوش خلقی کا برتاؤ کرنے کا تعلق مخاطب کے اچھا یا بُرا ہونے سے نہیں ہوتا بلکہ وہ تو ہمارا اپنا وصف ہے، سامنے والے کی برائی یا اس سے ہماری ناراضی کا اثر یہ ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اپنی اخلاقی خوبی سے غافل ہو جائیں، حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ: یا خلیلی! حَسِّنْ خُلُقَكَ ولو مع الکفّار[3]، میرے خلیل! اپنی عادتیں اچھی بناؤ خواہ تمہارا واسطہ کافروں سے ہی کیوں نہ پڑے۔ ظاہر ہے کہ ملت کا کوئی فرد خواہ کتنا ہی بُرا ہو اور فکر و رائے کی خواہ کیسی ہی سنگین کجی میں مبتلا ہو وہ بہرحال کافر و مشرک کے برابر نہیں ہو سکتا جب کافر بھی ہماری خوش خلقی کا مستحق ہے تو یہ مسلمان بدرجۂ اولیٰ ہماری خوش خلقی کا حقدار ہے۔

(۷) یہ احتیاط بہت ضروری ہے کہ جس بات اور جس شرعی معاملے کو سمجھنے کی جس میں اہلیت ہو وہ اسی سے بیان کیا جائے، بسا اوقات اس سلسلے کی ذرا سی بے احتیاطی ملت میں بعض بڑے بڑے سنگین قضیے پیدا کر دیتی ہے اسی لئے حضور سرورِ کائنات

---

[1] حوالۂ بالا۔ [2] یہ ارشادِ نبوی ہے جو متعدد مسندوں سے نقل ہوا ہے دیکھئے الجامع الصغیر مع شرح فیض القدیر ۵: ۴۸۔ [3] الترغیب والترہیب ۳: ۴۰۷۔

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو تاکید فرمائی ہے کہ: لوگوں کے سامنے بس وہی باتیں بیان کیا کرو جنھیں وہ سمجھ سکیں اور وہ باتیں نہ بیان کیا کرو جو اُن کے لئے ناقابلِ فہم ہوں[1]۔

(۸) ملت کا ہر شخص اتنا پڑھا لکھا نہیں کہ جملہ مسائل کتابوں سے ہی حاصل کر لے اور جو لوگ پڑھے لکھے ہیں وہ بھی اپنی الجھنیں حل کرنے کے لئے کسی نہ کسی اپنے سے زیادہ صاحبِ علم سے اپنا تعلق رکھتے ہیں، اور ایسا کرنا بہت مناسب اور ضروری ہے، اس لئے یہ احتیاط ضرور کرنی چاہئے کہ جو شخص جس عالمِ دین یا جس کسی بزرگ یا صاحبِ فہم شخص سے وابستہ ہو اُن صاحب سے اس کی عقیدت و حسنِ ظن کو مجروح نہ کیا جائے ہمیں کیا خبر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کہاں کہاں سے اور کِس کِس کے ذریعہ ہدایت کا پیغام دیتا ہے، ہم کسی کو اس کے معتمد شخص سے بدگمان کر کے کیوں کسی کے استفادے کا راستہ بند کریں۔

یہ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں غور کرنے سے سمجھ میں آ سکتی ہیں اگر ایسی چیزوں کی احتیاط کی جائے اور مختلف قسم کے معاشرتی حقوق اور اخلاقی تقاضوں کا لحاظ رکھا جائے اور جماعتی حد بندیوں اور مختلف مصلحتوں کو اس میں حائل نہ ہونے دیا جائے تو یقین ہے کہ فرد و ملت کے مختلف طبقات کے درمیان قرب و یگانگت اور صلح و آشتی کی فضا قائم ہو جائے گی اور فاصلے بڑی حد تک گھٹ جائیں گے۔

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

---

[1] رواہ البخاری موقوفاً علی علیؓ والدیلمی فی مسند الفردوس مرفوعاً وابونعیم فی مستخرجہ علی صحیح مسلم۔ (الجامع الصغیر مع شرحہ فیض القدیر ۳: ۳۷۷)